اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

[یہ مقالہ ۱۲ ستمبر ۴۰ء کو "انجمن اسلامی تاریخ و تمدن" کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا گیا]

حضرات!

اس مقالہ میں مجھے آپ کے سامنے اس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء

اہلِ علم کے اس مجمع میں مجھے اس حقیقت کی توضیح پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو، مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں سے بن کر

تیار ہو اور پھر اُدھر سے لاکر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائیٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبیعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم Prerequisites، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائیٹی میں بہم ہو گئے ہوں پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، ان کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو اپنی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے اسکے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں،

اسی طرح کا جماعتی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبیعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزون و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اسکو (Ideological State) کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت

اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اسکو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ رگ میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرون ہند کے وہ ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت Nation State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر (Nationalistic ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک پیش نظر

مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اس کے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے، ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، اور جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority rule) کے مسلم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں انکے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، انکی انفرادیت اسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جزء ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام

اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں تمہاری اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اِس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال وحرکات ماہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد یہی نیشنلزم اور نیشن اسٹیٹس ہیں، ان کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور اپنے نیشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپکی عقل یہ قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے

سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جسکی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم پر اسلیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے مالیات، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، اسکے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِنکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِنکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ اِنکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِن کے وزرائے خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شائد اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ

ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جنکے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے جنکی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے انکے دست قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت انکے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اِس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیشِ نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا

خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کرچکا ہوں، کسی سوسائیٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، ان کے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک تولیموں کی حیثیت سے نشو و نما پائے، اگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور رکارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائیٹی میں اُسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کرسکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual leadership) کا سکہ جمادیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اُسکے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر،

قربانیاں کرکے، مار کھاکر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائش کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ، کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ابنائے پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اس میں انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائیٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبیعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

حضرات! یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ آپ سب اہل علم لوگ ہیں۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے

لیڈر شپ نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار، لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈر شپ اور اُن ہزار ہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فشتے، گیوستے، نیتشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدو جہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر موسیو رینو یقین رکھتے تھے۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم

چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موبنجے یاسادر کرہو یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اسکے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر مسلمان ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جارہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں، بلکہ الٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اُتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر، یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاس قدسیہ"

سے یَدۡخُلُونَ فِی دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکہ جمیگا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دھندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ——— پھر جس لیڈر شپ کی اِعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈرشپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مرجائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات،

اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ تعلیم جو آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جارہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزارت تک فراہم کرسکتی ہے، مگر برا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کرسکتی۔ اور یہ بات آپ ہی کے اس نظام تعلیم تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظام تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیر مال، ایک وزیر جنگ ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کرسکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اسکے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں انکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہوجائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہوچکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود، نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کرسکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں نظام حکومت میں نہیں، صرف اسکی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کرسکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا

وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی مسلمان قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار اپنی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت"، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ حکومت کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

حضرات! اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے آپ کے سامنے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں

کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اِس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات ملتی ہی نہیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اِس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اِس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظمِ مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ

سے اس تحریک کے طریقِ کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ معاشی استحصال (Economic exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک کو نہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اِس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتداء میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent)

اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحبِ امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے

ہی بندے ہیں - رب اور مولیٰ صرف ایک ہے - لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کردے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابند حکم بن جا - یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے - اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں -

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہ راست پیش کردیا - انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کرکے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں - یہ سب کچھ، کچھ نہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کردیا - اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری - اسکی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے - دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا - جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے - اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہوسکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں اسکے لیے کشش [illegible] حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں - لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے -

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے ایسے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائیگی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی در رہے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز

میں محسوس ہوا، اسلیے الکفر ملة واحدة، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔ ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی

کا طاری ہونا ایک طبیعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جدوجہد مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اُسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ انکے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر وہ کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے،

. . . . . اور اس دعوت کو لے کر ایسے

لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے

ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند، بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپکو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں

کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علی کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لیکر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی، ان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے

حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر ان کے دل اندر سے بھیج رہے ہونگے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا سٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اس کو کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی یہ دور اسلامی ائیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہ وحشی قائل

ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۹ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگ جو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلیٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچکے تھے۔ ان کا احساسِ دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروروں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا

تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ ایلچی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی ان کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی

پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھ دیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے اسلیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (آئیڈیلسٹ) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آگئے تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

حضرات! یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی

اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی امیدوں کا لوا اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائیٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن، جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے صرف چند کلمے اور عرض کرنے ہیں جنکے بعد میں اپنی اس سمع خراشی کو ختم کر دونگا۔ تقدیر الٰہی نے آپکے اس علیگڈھ کو ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز اعصاب (Nerve-centre) بنا دیا ہے۔ میں اس امر واقعی کا پورا ادراک رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے آج سے چار یا پانچ سال پہلے علی گڈھ ہی کو مخاطب کر کے اس نئے نظام تعلیم کا ایک نقشہ پیش کیا تھا جسکی، میرے نزدیک اسلام کی نشاۃ جدیدہ کے لیے ضرورت ہے اور آج پھر اسی ادراک کی بنا پر میں علیگڈھ ہی کو مخاطب کر کے اس تحریک کا نقشہ پیش کر رہا ہوں جو اسلامی طرز کا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ہی ممکن تحریک ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جو کچھ پہنچانا تھا اور جس مناسب جگہ پہنچانا تھا، میں پہنچا چکا ہوں۔ اب اسکی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کہ میں آپکے دل بھی بدل دوں۔